13085CH22

باب 22

اُردو کے ادبی دبستان، ادارے، تحریکات اُور رجحانات : مختصر جائزہ

اردو زبان و ادب کے فروغ اور ارتقا میں مختلف دبستانوں، اداروں اور تحریکات و رجحانات کا اہم کردار رہا ہے۔ دبستان، ادارے اور تحریکیں مختلف ادوار میں زبان و ادب کو نئے رویّے، نئے افکار و تصورات اور نئے اسالیب سے متعارف کرانے اور انھیں نئے امکانات اور نئی سمتوں سے روشناس کرانے میں بے حد معاون ثابت ہوئیں۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں ابتدائی دور سے ہی ایسے دبستانوں، اداروں اور تحریکوں کی خدمات اور ان کے کارہائے نمایاں کے شواہد ملتے ہیں۔ ایسے دبستانوں، اداروں اور تحریکوں میں نمایاں طور پر دبستانِ دلّی، دبستانِ لکھنؤ، فورٹ ولیم کالج، قدیم دلّی کالج، سرسید تحریک، انجمن پنجاب، دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ، انجمنِ ترقی اردو، ترقی پسند تحریک، حلقۂ اربابِ ذوق اور جدیدیت اہمیت کے حامل ہیں۔

دبستانِ دہلی :

ماضی میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں بعض شہروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ وہ شہر تھے جہاں بڑی تعداد میں شاعر اور ادیب جمع ہوگئے تھے اور ان کی سرپرستی کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ انھیں ادبی مراکز میں سے ایک دہلی ہے۔ اردو شاعری کے فروغ میں اس شہر کی بڑی اہمیت ہے یہاں تک کہ اسے ایک باقاعدہ ادبی اسکول کی حیثیت حاصل ہے۔ اس ادبی اسکول کو 'دبستانِ دہلی' کہا جاتا ہے۔

شہر دہلی عرصۂ دراز تک ہندوستان کا پایۂ تخت رہا ہے۔ اس کی مرکزیت کی وجہ سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کے ساتھ ساتھ شعرا کی بڑی تعداد بھی یہاں ہر دور میں موجود رہی ہے۔ ان میں مقامی شعرا بھی تھے اور بیرونی بھی۔ اس طرح اردو شعر و ادب کی تاریخ میں دہلی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ مرکزیت کے اظہار کے لیے 'دبستانِ دہلی' یا 'دہلی اسکول' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے یہاں کے مشاہیر شعرا کے نام اس طرح ہیں :

- آرزو، آبرو، ناجی، یک رنگ، مضمون
- مرزا مظہر جانِ جاناں، حاتم
- میر، سودا، درد، قائم، میرحسن
- میر سوز، جرأت، شاہ نصیر
- ذوق، مومن، غالب

دبستانِ دہلی کے نمائندہ شعرا کا امتیاز یہ ہے کہ اپنی بات سیدھے سادے اور دل نشیں انداز میں کہتے ہیں۔ ان کے یہاں عام طور سے تصنع نہیں پایا جاتا۔ ان کی شاعری میں داخلیت زیادہ ہے، خارجیت کم۔ یعنی وہ اپنے جذبات کے اظہار پر زور دیتے ہیں۔

غزل روزِ اوّل سے حسن و عشق کے معاملات کے اظہار کا ذریعہ رہی ہے۔ دہلی کے شعرا نے بھی محبوب کے حسن کی تعریف کی ہے اور ہجر و وصل کے قصّے سنائے ہیں لیکن انھوں نے جذبۂ عشق کا اظہار مہذّب طریقے سے کیا ہے۔ انھیں وصل سے زیادہ ہجر عزیز ہے۔

مضامینِ تصوّف بھی دہلوی شعرا کو بے حد مرغوب ہیں۔ دہلی علما اور صوفیا کا مسکن تھی۔ بعض شاعر خود بھی صوفی تھے۔ جو عملاً صوفی نہیں تھے، وہ بھی صوفیانہ خیالات کو شعر کے لیے موزوں سمجھتے تھے مثلاً درد صوفی شاعر تھے۔ میر کی بھی اسی فضا میں تربیت ہوئی تھی۔ دلی کی بربادی اور خوف و دہشت کے ماحول نے بھی اردو شاعری میں مضامینِ تصوّف کو فروغ دیا۔

دبستانِ لکھنؤ :

اورنگ زیب کی وفات (1707) کے بعد ان کے وارثین کے درمیان ہونے والی جنگوں، درباری سازشوں اور بیرونی حملوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ مغلیہ سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی۔ دہلی بے رونق ہوئی تو فیض آباد اور پھر لکھنؤ کو عروج حاصل ہوا۔

اودھ کے صوبے دار سعادت خاں نے فیض آباد کو دارالسلطنت بنایا اور برہان الملک کا لقب اختیار کیا۔ برہان الملک کے بعد صفدر جنگ اور پھر شجاع الدولہ کے عہد تک فیض آباد اودھ کا صدر مقام رہا۔

آصف الدولہ کے دور میں فیض آباد کے بجائے لکھنؤ دارالحکومت قرار پایا اور آصف الدولہ کی سخاوت اور لکھنؤ کی خوش حالی کا شہرہ ہوا۔ پھر غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کا زمانہ آیا۔ سیاسی اعتبار سے انگریزوں کا عمل دخل بڑھا لیکن لکھنؤ کی گہما گہمی اور رونق میں کمی نہیں آئی۔

سلطنتِ اودھ کی خوش حالی کا شہرہ سن کر دہلی کے متعدد شاعروں نے فیض آباد اور پھر لکھنؤ کا رخ کیا۔ جو شاعر پہلے فیض آباد پہنچے تھے، وہ بھی بعد میں لکھنؤ آ گئے۔ اس طرح لکھنؤ میں ادیبوں اور شاعروں کی ایک دنیا آباد ہوگئی۔ میر ضاحکؔ، میر سوزؔ، سودا، میر حسنؔ وغیرہ شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد پہنچ چکے تھے۔ میر تقی میرؔ، جرأتؔ، انشاؔ اور مصحفیؔ آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ پہنچے۔

لکھنؤ میں شعر و شاعری کا آغاز اُن شاعروں کی بدولت ہوا جن کی زندگی کا بڑا حصّہ دہلی میں گزرا تھا۔ وہ شاعری میں اپنی پرانی روش پر قائم رہے۔ لیکن وہ لوگ جو کم عمری میں فیض آباد یا لکھنؤ آئے تھے یا جنھوں نے فیض آباد یا لکھنؤ میں ہی آنکھیں کھولی تھیں، جب انھوں نے شاعری شروع کی تو دہلی کے مقابلے ایک نیا لب ولہجہ، نئی فکر اور نئے اسالیبِ شعر سامنے آئے۔ یہیں سے دبستانِ لکھنؤ کا آغاز ہوتا ہے۔

دبستانِ لکھنؤ کے اہم شاعروں کی فہرست طویل ہے۔ ان میں رنگینؔ، انشاؔ اور جرأتؔ اور ان کے بعد آنے والوں میں آتشؔ اور ناسخؔ اہم ترین ہیں۔ امام بخش ناسخؔ دبستانِ لکھنؤ کے سب سے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان سے دبستانِ لکھنؤ کو استحکام حاصل ہوا۔ اسی دور میں زبان کی اصلاح ہوئی۔ متروکات کی فہرست سازی ہوئی۔ شاعری کے نئے اصول و ضوابط مقرر ہوئے۔ اس ضمن میں ان کے شاگرد علی اوسط رشکؔ کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ رشکؔ کے علاوہ بحرؔ، وزیرؔ، منیرؔ، برقؔ وغیرہ کا شمار ناسخؔ کے مشہور شاگردوں میں ہوتا ہے۔ آتشؔ کے شاگردوں میں پنڈت دیا شنکر نسیمؔ، رندؔ، صباؔ، شوقؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

لکھنؤ کی خوش حالی اور عیش و عشرت کی زندگی نے شعر و ادب کو بھی متاثر کیا۔ شاعری میں نشاطیہ لب ولہجہ عام ہوا۔ داخلیت پر خارجیت کو غلبہ حاصل ہوا۔ اعضائے بدن ہی نہیں، لباس اور زیورات کی تفصیلات بھی رقم ہونے لگیں۔ نازک خیالی اور زبان کی شیرینی پر زور دیا گیا۔ شعری صنعتوں کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہونے لگا اور رعایتِ لفظی کی طرف توجہ زیادہ ہوگئی۔ لکھنؤ میں غزل کے علاوہ جن اصنافِ سخن پر خاطر خواہ توجّہ دی گئی ان میں مرثیہ، مثنوی، قصیدہ، ریختی اور واسوخت قابلِ ذکر ہیں۔

فورٹ ولیم کالج (1800) :

اٹھارھویں صدی کے آخر میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریز جنوبی ہندوستان پر بھی قابض ہوگئے۔ تاجر بن کر آنے والی یہ غیر ملکی قوم پورے ہندوستان پر حکومت قائم کرنے کے منصوبے کے مطابق حکمتِ عملی تیار کرنے لگی۔

انگریز اس حقیقت سے واقف تھے کہ تجارت کے فروغ اور ملک پر حکمرانی کے لیے یہاں کی زبان، طور طریقوں، رسم و رواج اور قاعدے قانون سے واقفیت ضروری ہے۔ اس وقت حکومت کی زبان فارسی تھی۔ لیکن عوامی سطح پر بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو تھی۔ انگریز گورنر جنرل ویلزلی نے یہ محسوس کیا کہ انگلینڈ سے آنے والے نئے حکام اور عام ملازمین دیسی زبانوں سے واقف ہوں تو یہاں کے مالی اور فوجی انتظامات بہتر طور پر سنبھالے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ 4 مئی 1800 کو ایک مستقل تعلیمی ادارے 'فورٹ ولیم کالج' کا قیام عمل میں آیا۔ ویلزلی نے کالج میں کئی شعبے قائم کیے اور لائق اساتذہ کا تقرر کیا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو ہندوستانی زبان کے شعبے کا صدر منتخب کیا گیا۔ گلکرسٹ نے زبان کے مسائل میں گہری دل چسپی لی۔ انھوں نے نہ صرف خود تصنیف و تالیف کا کام کیا بلکہ اس عہد کے کئی نامور نثر نگاروں کی خدمات حاصل کیں اور ان سے ایسی کتابیں ترجمہ، تصنیف و تالیف کرائیں جن میں سے اکثر آج بھی اہمیت رکھتی ہیں۔

ان نامور قلم کاروں میں میر امّنؔ، حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوانؔ، مرزا علی لطفؔ، شیر علی افسوسؔ، میر بہادر علی حسینی، مظہر علی خاں ولاؔ اور للّو لال جی قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں کی تصانیف میں میر امّن کی 'باغ و بہار' کا نام سرِ فہرست ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی شائع کردہ کتابوں سے ایک طرف جدید نصابی ضرورتوں کا تصوّر ذہن میں روشن ہوا تو دوسری طرف سادہ اور سلیس نثر لکھنے کی روایت قائم ہوئی۔ اس کی بدولت اردو نثر فارسی آمیز اور پُر تصنع اسلوب سے نکل کر جدید دور میں داخل ہوئی۔ گلکرسٹ نے چھاپے کے لیے اردو ٹائپ کا مطبع قائم کیا جس سے اردو کتابوں کو شائع کرنے کا چلن عام ہوا۔

فورٹ ولیم کالج میں درسی کتابوں کو چھاپتے وقت کتابوں میں مشقیں، فرہنگیں، تعارفی نوٹ اور ضروری حاشیے بھی درج کیے جاتے تھے۔ صحیح تلفّظ کے لیے اعراب یعنی، زبر، زیر، پیش کا استعمال کیا گیا۔ دو لفظوں کے درمیان فاصلہ، دو مصرعوں کی ترتیب، پیراگراف، واوین اور کاما وغیرہ سے فقروں کو واضح کرنے کا طریقہ رائج ہوا۔ کالج نے طباعت و اشاعت میں نئے نئے تجربے کیے۔ نصابی کتابوں کی تیاری، پرانی کتابوں سے انتخاب، املا اور اسلوبِ نثر کی معیار بندی اور صحیح طباعت کی جانب توجہ دی گئی۔ 'باغ و بہار'، 'مثنوی سحر البیان' اور 'کلیاتِ میر' کی طباعت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

میر شیر علی افسوؔس (1809-1732) : میر شیر علی افسوس نارنول کے رہنے والے تھے، دہلی میں پیدا ہوئے۔ فیض آباد لکھنؤ اور بنارس میں ان کا قیام رہا۔ 1800 میں فورٹ ولیم کالج میں مترجم کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کے ذمے ترجمے کے ساتھ ساتھ مسوّدات کی تصحیح کا کام بھی تھا۔ ان کی مشہور کتابوں میں 'گلستاں' کا اردو ترجمہ 'باغِ اردو' ہے۔ سجان رائے بھنڈاری کی فارسی کتاب 'خلاصۃ التواریخ' کا اردو ترجمہ انھوں نے 'آرائشِ محفل' کے نام سے کیا۔

میر امّن (1837-1750) : ان کا تفصیلی تعارف باب-15 (اردو میں داستان گوئی کی روایت) میں کیا جا چکا ہے۔

میر بہادر علی حسینی : میر بہادر علی حسینی کا تعلق دلّی سے تھا۔ وہ 1801 سے 1808 تک فورٹ ولیم کالج میں رہے۔ گل کرسٹ نے ان کی لیاقت کی بڑی تعریف کی ہے۔ انھوں نے 'نثرِ بے نظیر' کے نام سے 'مثنوی سحر البیان' کا خلاصہ، 'اخلاقِ ہندی' کے عنوان سے، سنسکرت کی مشہور کتاب 'ہتو پدیش' کا ترجمہ، 'نقلیات' کے نام سے، دو جلدوں میں کہانیوں کا مجموعہ اور 'رسالۂ گل کرسٹ' کے نام سے گل کرسٹ کی قواعد کا اردو میں خلاصہ شائع کیا۔ ان کے علاوہ کئی دوسری کتابوں کی تیاری میں بھی ان کا تعاون شامل رہا ہے۔

گلکرسٹ (1841-1759) : ڈاکٹر جان بارتھ۔ وِک گلکرسٹ جنوبی افریقہ کے شہر ایڈنبرا میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ بعد میں ایڈنبرا یونیورسٹی سے انھوں نے طِب کی تعلیم حاصل کی۔ روزگار کی تلاش میں پہلے وہ ویسٹ انڈیز گئے جہاں انھوں نے نیل کی کاشت کاری سیکھی اور چند سال وہاں رہ کر 1782 میں ممبئی آ گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت فوجی طِبی عہدے پر ان کا پہلا تقرر سورت میں ہوا۔ ہندوستان آنے کے بعد انھوں نے یہ محسوس کیا کہ مقامی باشندوں کی زبان سے واقفیت کے بغیر وہ اپنی منصبی ذمے داریاں بہ خوبی نہیں نبھا سکتے۔ اپنے اسی احساس کے تحت گلکرسٹ نے پوری توجہ سے ہندوستانی زبانوں کا مطالعہ کیا۔ جس کی بدولت انھوں نے ایک استاد اور پھر محقق کا درجہ حاصل کر لیا۔

1800 میں گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے صدر مقرر ہوئے۔ انھوں نے ہندوستانی انگریزی لغت، ہندوستانی علم اللسان، اردو صرف ونحو اور مشرقی زبان دانی جیسے موضوعات پر مشتمل تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں لکھی ہیں۔ انھوں نے تصنیف، تالیف، طباعت، ترجمہ اور املا وغیرہ میں جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر اردو زبان کو بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کیا۔ 1805 میں وہ انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں بھی انھوں نے اردو درس وتدریس کا کام جاری رکھا۔ ان کا انتقال پیرس میں ہوا۔

حیدر بخش حیدری (1768/69-1813/14) : ان کا تذکرہ باب۔15 میں کیا جاچکا ہے۔

مظہر علی خاں وِلاؔ : مظہر علی دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ فورٹ ولیم کالج میں انھوں نے مادھونل اور کام کنڈلا کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ برج بھاشا سے 'بیتال پچیسی' کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔

قدیم دلّی کالج (1825) :

انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کے بعد انگریزوں کا قائم کردہ دوسرا بڑا تعلیمی و تصنیفی ادارہ 'دلّی کالج' تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد انگریز سول اور فوجی ملازمین کو ہندوستانی زبان بالخصوص اردو سکھانا تھا۔ اس کے برعکس دلّی کالج ہندوستانی نوجوانوں میں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم اور انگریزی زبان کو عام کرنے کے مقصد سے قائم کیا گیا تھا۔ 1825 میں غازی الدین حیدر کے مدرسے میں 'دلّی کالج' کا قیام عمل میں آیا۔ مسٹر ٹیلر اس کے سیکریٹری اور پرنسپل مقرر ہوئے۔

دلّی کالج میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم و تدریس کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ کئی لائق اور باصلاحیت اساتذہ رکھے گئے تھے۔ تین سال بعد انگریزی کا شعبہ قائم ہوا۔ 1830 میں جب اعتماد الدولہ نے ایک لاکھ ستر ہزار روپے کی رقم اس کالج کے لیے وقف کی تو اس کی ترقی کا نیا دور شروع ہوا۔ نئے نصاب مرتّب ہوئے۔ درسی کتابیں تیار کی گئیں۔ ترجمے کے کام میں تیزی آئی۔ طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ کچھ ہی برسوں میں دلّی کالج نے ایک اہم تعلیمی مرکز کی حیثیت حاصل کر لی۔

اس دور کے کئی نامور ادیب اور شاعر اس سے وابستہ ہو گئے۔ ان میں مولانا صدر الدین آزردہؔ اور امام بخش صہبائیؔ بھی شامل تھے۔ ان ادیبوں نے دلّی کالج کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصّہ لیا۔ سالانہ مشاعرے کا انعقاد اور ادبی بحث و مباحثہ کا دور شروع ہوا۔ یہ کالج اجمیری دروازے کے پاس واقع تھا۔

اس کالج کو کئی مخلص اور لائق پرنسپل بھی ملے۔ ان میں مسٹر ٹیلر، بوترو اور ڈاکٹر اشپرنگر کے نام بے حد اہم ہیں۔ کالج کے قیام کے ساتھ ہی اس ضرورت کا احساس ہوا کہ اعلیٰ درجے کی علمی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔ اس مقصد کے تحت 1843 میں 'دہلی ورنا کیولر سوسائٹی' قائم ہوئی۔ اس سوسائٹی نے سائنس، ریاضی، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات سے متعلق انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے کرائے۔ اصطلاح سازی اور ترجمے کے اصول مرتّب کیے گئے۔

کالج کے اساتذہ نے اپنی علمی وادبی سرگرمیوں کو کالج تک محدود نہ رکھا بلکہ اخبارات اور رسائل کے ذریعے ملک بھر میں پھیلایا۔ کالج کے لائق استاد ماسٹر رام چندر کی ادارت میں نکلنے والے اخبار 'فوائدالناظرین' اور رسالہ 'محبِّ ہند' میں مختلف مضامین کے ساتھ یورپ کی ترقیات اور ایجادات کی تفصیلات بھی شائع ہوتی تھیں۔ اخبار میں جدید تقاضوں کے تحت ادبی، سیاسی، سماجی اور اصلاحی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔

دلّی کالج کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور سائنس، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، قانون، طب، منطق فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اس کی بدولت اردو کے علمی وادبی سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ اردو زبان میں نئی نئی اصطلاحات اور الفاظ شامل ہوئے۔ دلّی کالج نے کئی روشن خیال علمی وادبی شخصیتوں کو پیدا کیا۔ ان میں ماسٹر رام چندر، مولانا امام بخش صہبائی، مولوی مملوک علی نانوتوی، پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاءاللہ، محمد حسین آزاد، مولوی ضیاءالدین، سید ناصر علی اور مدن گوپال کے نام قابل ذکر ہیں۔

1857 میں کالج کا پہلا دور ختم ہوگیا۔ اسی بنا پر اسے 'قدیم دلّی کالج' کہا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں اس کالج کو 'اینگلو عربک کالج' کے نام سے دوسری زندگی ملی۔ آزادی کے بعد 1948 میں اسے پھر 'دہلی کالج' کا نام دیا گیا۔ موجودہ دور میں اس کا نام 'ذاکر حسین دہلی کالج' ہے۔

انجمنِ پنجاب (1865) :

1857 میں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور سارے ملک پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ دہلی اور لکھنو کے اجڑنے کے بعد بعض ادیب وشاعر ہجرت کرکے لاہور پہنچے۔ ان میں محمد حسین آزاؔد، منشی پیارے لال آشوؔب، مولوی سید احمد دہلوی، مولوی کریم الدین اور خواجہ الطاف حسین حالی بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

لاہور اس وقت علم وادب کی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل جی، ڈبلو لائٹنر (Dr. G. W. Lietnor) مشرقی علوم میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے حکومتِ پنجاب کے ایما پر پنڈت من پھول کی صدارت میں 21 / جنوری 1865 کو 'انجمنِ مطالبِ مفیدۂ پنجاب' قائم کی جسے عام طور پر 'انجمنِ پنجاب' کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر لائٹنر کو اس کا صدر بنایا گیا۔ انجمن کے سرپرست اور محرّک اصلاً کرنل ہالرائڈ تھے لیکن ان کے منصوبوں کو عملی شکل ڈاکٹر لائٹنر نے عطا کی۔ انجمنِ پنجاب کے درجِ ذیل مقاصد تھے :

© NCERT not to be republished

- قدیم مشرقی علوم کی ترویج واشاعت — دیسی زبان کے ذریعے عوام میں تعلیم کا فروغ
- صنعت اور تجارت کی ترقی — معاشرتی، ادبی، سائنسی اور عام دلچسپی کے سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیال کرنا اور حکومت کے تعمیری کاموں کو مقبول بنانا۔
- صوبے کے باثر اہلِ علم اور افسروں کے درمیان رابطہ قائم کرنا۔
- انگریزوں کی بابت ہندوستانی عوام میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنا۔

مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے مدرسوں اور کتب خانوں کا قیام عمل میں آیا۔ ادیبوں نے مختلف سماجی، تہذیبی علمی، ادبی، تعلیمی اور اخلاقی موضوعات پر مضامین لکھے۔ لیکچرز کا اہتمام کیا گیا اور بحث ومباحثے کا نیا دور شروع ہوا۔ لائٹنر نے کئی اہلِ قلم کو اس انجمن سے وابستہ کیا۔ ان میں محمد حسین آزاد سرِ فہرست تھے۔ محمد حسین آزاد لاہور کے ادبی حلقوں میں مشہور ہو چکے تھے۔ انھوں نے انجمن کے جلسے میں نئی شاعری کے عنوان سے ایک عالمانہ مقالہ پڑھا جسے لائٹنر نے بے حد پسند کیا اور لکچرر کے منصب پر ان کا تقرر کر دیا۔

محمد حسین آزاد کی وابستگی کے بعد انجمن پنجاب کو نئی تحریک اور توانائی ملی۔ لائٹنر کے بعد آزاد کو انجمن کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ کرنل ہالرائڈ، ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، پنجاب کی کوششوں سے 8/ مئی 1874 کو ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس میں حالی کا تعاون بھی شامل تھا۔ یہ مشاعرہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا۔ اس میں مصرعۂ طرح کے بجائے کوئی موضوع دیا جاتا تھا۔ اس کے تحت پہلا مشاعرہ 'برسات' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ اس قسم کے مشاعروں کا یہ سلسلہ کافی عرصے تک پابندی سے جاری رہا۔ حالی کی 'برکھارت'، 'نشاطِ امّید'، 'حبِّ وطن' اور 'مناظرۂ رحم وانصاف' وغیرہ نظمیں انجمن پنجاب ہی کی یادگار ہیں۔

انجمن نے ملک کی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر تصنیف وتالیف اور ترجمے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس سے اردو نظم نگاری میں ایک نئے رجحان کی ابتدا ہوئی۔ ادب اور زندگی کے رشتوں کا احساس پیدا ہوا۔ اس انجمن نے اردو شاعری کو ایک نئی فکر دی جو بعد میں جدید شاعری کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی۔

سرسیّد تحریک:

1857 کے ہنگامے کے نتیجے میں جو افراتفری اور انتشار برپا ہوا تھا، انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں وہ کافی حد تک رفع ہو گیا تھا اور ایک نئے نظام کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ حکمرانِ وقت یعنی انگریزوں کی زبان، ان کا طرزِ معاشرت، طریقۂ تعلیم اور نصابِ تعلیم، سیاست نیز کھیل کود کے مقابلے بھی ہندوستانی اپنانے لگے تھے۔ وطن

سے محبت، آزادی کی لگن، آزادیِ فکر، آزادیِ نسواں، جمہوری نظامِ حکومت، فنونِ لطیفہ، سائنسی نقطۂ نظر، غرض اس نوع کی تمام باتوں کو ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ قبول کر رہا تھا۔ سیاسی اور نیم سیاسی ادارے وجود میں آ رہے تھے۔ اسی پس منظر میں مسلمانوں کی سماجی و اخلاقی اصلاح اور شعوری بیداری کے لیے سرسیّد احمد خاں نے 'تعلیمی تحریک' کا آغاز کیا۔ انھوں نے اپنی اس تحریک کا دائرہ صرف تعلیم تک محدود نہ رکھا بلکہ اسے ادب، مذہب وعقائد اور تہذیب و معاشرت تک وسعت دی۔ سرسیّد کی ان کوششوں کو 'سرسید تحریک' یا 'علی گڑھ تحریک' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سرسید تحریک کا سب سے اہم مقصد جدید تعلیم کا فروغ تھا۔ انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کی ترقی کا واحد ذریعہ جدید تعلیم ہے۔ انھوں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ انگلینڈ کی یونیورسٹیوں کے طرز پر ہندوستان میں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک ادارہ قائم کریں۔ چنانچہ انھوں نے انگلینڈ کے اپنے سفر کے دوران کیمبرج اور آکسفورڈ کے تعلیمی نظام، طلبا کے طرزِ رہائش اور تعمیرات وغیرہ کا بہ غور جائزہ لیا۔ وہاں سے لوٹ کر 1875 میں علی گڑھ میں 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' (ایم۔اے۔او کالج) کی بنیاد ڈالی۔ 1920 میں اس کالج نے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرلیا۔ اب اس ادارے کا نام 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' ہے۔

سرسیّد کی علمی تحریک کا سلسلہ 'سائنٹفک سوسائٹی' سے شروع ہوتا ہے۔ یہ سوسائٹی 1864 میں غازی پور میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف مغربی علوم کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ جدید علوم سے واقفیت عام ہو سکے۔ سوسائٹی نے پندرہ کتابوں کے اردو ترجمے شائع کیے۔ اس کے علاوہ ایک اخبار 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے نام سے جاری کیا۔ جب کالج کے کاموں میں سرسید زیادہ مصروف ہوگئے تو سوسائٹی کی سرگرمیاں بھی کم ہوتی گئیں۔ آخر اسے کالج کمیٹی میں ضم کر دیا گیا۔ سرسیّد تحریک کے ضمن میں اس سوسائٹی کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

مسلمانوں کی فلاح اور ترقی کے لیے سرسید جدید تعلیم کے حصول کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے مسلمان تعلیمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے 1886 میں 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' قائم کی۔ ملک کے مختلف شہروں میں اس کے جلسے ہوا کرتے تھے جن میں جدید تعلیم کے حصول پر زور دیا جاتا تھا۔ یہ ادارہ اب بھی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے خدمات انجام دے رہا ہے۔

سرسید تحریک کا دوسرا اہم مقصد معاشرے کی اصلاح تھا۔ چنانچہ سرسیّد نے حصولِ تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے پر بھی زور دیا۔ انگلینڈ کے اپنے سفر کے دوران وہ انگریزوں کی شائستگی اور تہذیب

2019-20

سے بہت متاثر ہوئے۔ یہاں انھیں معلوم ہوا کہ انگلینڈ کے باشندے بھی پہلے طرح طرح کی معاشرتی برائیوں میں مبتلا تھے۔ تاہم رچرڈ اسٹیل اور ایڈیسن نام کے دو صاحبِ نظر حضرات نے دو رسالے 'ٹیٹلر' اور 'اسپیکٹیٹر' جاری کیے اور اپنے معاشرے کی اصلاح میں کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ سرسید نے طے کیا کہ وہ بھی اسی طرح اپنے ملک میں اصلاحِ معاشرہ کی خدمت انجام دیں گے۔ ہندوستان واپس آکر انھوں نے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا اور اس میں معاشرتی و اصلاحی موضوعات پر مضامین لکھے جانے لگے۔

سرسید کی ان تعلیمی اور اصلاحی خدمات سے اردو زبان و ادب کو بھی فیض پہنچا۔ سرسید کے عہد سے پہلے علمی موضوعات پر اظہارِ خیال کے لیے یا تو فارسی زبان استعمال کی جاتی تھی یا اردو کی دقیق اور پیچیدہ نثر۔ سرسید نے اردو میں سادہ اور بے تکلف علمی نثر کو رواج دیا۔ 'تہذیب الاخلاق' میں جن علمی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی موضوعات پر مضامین لکھے گئے، وہ اردو میں نئے تھے۔ ان مسائل و مباحث کے لیے ایک نئے طرز اور نئے اسلوب کی بھی ضرورت تھی۔ سرسیّد نے اس نئے اندازِ تحریر کو خود ایجاد کیا۔ سادگی اور بے تکلفی اس طرزِ تحریر کی خوبی ہے۔ سرسید کی بدولت اردو نثر علمی اور سائنسی موضوعات پر اظہارِ خیال کے قابل بن گئی۔

سرسید کو اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کے ضمن میں ایسے باکمال رفیق اور ساتھی ملے جنھوں نے اردو نثر کی روایت کو آگے بڑھایا اور اسے استحکام بخشا۔ ان میں مولانا الطاف حسین حالؔی، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزادؔ، مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور مولوی ذکاء اللہ کے نام شامل ہیں۔

ان اہلِ قلم نے اردو زبان و ادب کی توسیع میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مغربی ادب کی بعض نئی اصناف سے بھی متعارف کرایا۔ ہمارے قدیم ادب میں یا تو ان کا سرے سے وجود ہی نہ تھا یا اگر تھا تو ان کی شکل مختلف تھی۔ ان میں بعض نئے رجحانات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں مثلاً 'نیچرل شاعری کی تحریک' جسے آزادؔ اور حالؔی نے فروغ دیا۔ نیچرل شاعری سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جائے، وہ فطری جذبے کے تحت فطری انداز سے لکھا جائے۔ قدیم طرز کی شاعری سے انحراف بھی اسی تحریک کا ایک جُز ہے۔ اردو میں جدید تنقید کا آغاز بھی سرسید اور رفقائے سرسید سے ہوتا ہے۔ ان کے رفیقوں میں حالؔی اور شبلی نے اردو تنقید کو بلند مقام پر پہنچایا۔ انھوں نے سوانح نگاری کے فن کو بھی فروغ دیا۔ تاریخ نگاری کا علمی انداز بھی اسی دور میں شروع ہوا۔ اس ضمن میں شبلی، عبدالحلیم شررؔ اور ذکاء اللہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اردو میں نئے طرز کے قصّے لکھ کر ناول کو مقبول بنایا۔ اس عہد میں مقالہ نگاری کا رواج بھی عام ہوا۔ محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، شبلؔی، اور حالؔی کے مقالے اردو ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔

سرسیدتحریک کی خدمات تاریخی،سماجی اورادبی ارتقا کی راہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔اس تحریک نے بیداری کے اس دور کا آغاز کیا جس کی بدولت ادب کا رشتہ زندگی سے مستحکم ہوگیا نیز صحت منداورتوانا اسالیب وجود میں آئے۔ادب،سماج اورتہذیب کی اصلاح وترقی کا ذریعہ بن گیا۔

انجمن ترقّی اردو(ہند) (1903) :

اردوکی علمی اورادبی حیثیت کوجن اداروں نے فروغ بخشا ان میں انجمن ترقی اردوخصوصی اہمیت رکھتی ہے۔یہ انجمن شروع میں 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' کی ایک ضمنی شاخ تھی جس نے ایک مستقل ادارے کی حیثیت اختیار کرلی۔ اس کے پہلے صدر پروفیسر آرنلڈ اورنائب صدور ڈپٹی نذیراحمد،مولوی ذکاءاللہ اورمولانا حالی تھے۔شبلی نعمانی اس انجمن کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔انجمن کے مقاصد درج ذیل تھے :

- اصلاحِ زبان یعنی غیرمانوس،اجنبی الفاظ ومحاورات کورفع کرنااوران سے بچنااورصحیح اورفصیح زبان کورواج دینا۔
- ہندوستان کے جن اضلاع میں اردوکارواج نہیں ہے یا کم ہےان میں اردوزبان کورواج دینے کی کوشش کرنا۔
- قدیم ادبی تصانیف کوضائع ہونے سے بچانااورجدیدکوترقی دینا۔
- علمی کتب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اصطلاحات مرتّب کرنا۔

شروع میں انجمن کا دفترعلی گڑھ میں تھا۔1912 میں جب مولوی عبدالحق سکریٹری منتخب ہوئے توانجمن کا دفتر اورنگ آباد منتقل ہوگیا۔جواس زمانے میں ریاست حیدرآباد کاایک حصّہ تھا۔یہاں انجمن کوپھلنے پھولنے کا بھرپورموقع ملا۔ کچھ عرصے بعد یہ محسوس ہوا کہ انجمن کا دفترکسی مرکزی مقام پرہونا چاہیے تاکہ اردوکی اشاعت وترقی کا کام ملک گیرپیمانے پرکیاجاسکے اس لیےنومبر1938 میں اسے دہلی منتقل کردیا گیا۔

'بابائے اردو' کی کوششوں سے انجمن نےعلمی وادبی کتابوں کی اشاعت کے علاوہ اردوتحریک کوفروغ دینے میں قائدانہ کردارادا کیا۔ابتدا میں انجمن نے خالص علمی اورادبی ادارے کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیے۔ انجمن کی سرپرستی میں کتب خانے قائم کیے گئے۔مختلف زبانوں کی کتابوں کے تراجم ہوئے۔'اردو'اور'سائنس' جیسے رسالوں کا اجراعمل میں آیا۔اپریل1939 میں'ہماری زبان' جاری ہوا۔انجمن نے اردوادب کی کئی قدیم اورنایاب کتابیں اورشعرا کے دیوان شائع کیے۔

© NCERT not to be republished

انجمن ترقی اردو نے علمی وادبی خدمات کے ساتھ سماجی اور سیاسی سطح پر اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف عملی جدوجہد میں بھی حصّہ لیا۔ اردو کے تحفظ اور فروغ کے لیے کئی اردو مراکز کا قیام عمل میں آیا۔ انجمن کی کوششوں سے کئی اسکولوں، کالجوں اور مدرسوں میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ انجمن کے ذریعے ملک کی آزادی تک تقریباً دوسو کتابیں شائع ہوچکی تھیں۔ ان میں ادب، تاریخ، تذکرے، سیاسیات، فلسفہ، قانون، قواعد وغیرہ جیسے اہم موضوعات سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ آزادی کے بعد بھی انجمن ترقی اردو (ہند) کا علمی وادبی سفر جاری ہے جس کا مرکزی دفتر دہلی میں ہے۔

دارالمصنفین، اعظم گڑھ (1915) :

دارالمصنفین ملک کا مشہور تحقیقی و تصنیفی ادارہ ہے۔ اس کا خاکہ مولانا شبلی نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں تیار کرلیا تھا، مگر اس کا قیام ان کی وفات (1914) کے بعد ان کے عزیز شاگردوں مولانا حمیدالدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کے ہاتھوں 1915 میں عمل میں آیا۔ دارالمصنفین کے قیام کے بعد مولانا مسعود علی ندوی اس کے انتظامی امور کے سربراہ، مولانا سید سلیمان ندوی تحقیقی و تصنیفی امور کے ناظم اور مولانا عبدالسلام ندوی اس کے رفیقِ تصنیف وتالیف مقرر ہوئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی باہرہ کر اس کے عمومی وانتظامی امور میں معاون رہے۔ 1916 میں سید سلیمان ندوی کی ادارت میں دارالمصنفین سے رسالہ 'معارف' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کی اشاعت کا سلسلہ اب بھی قائم ہے۔ اس کا شمار ملک کے بلند پایہ علمی وتحقیقی رسائل میں کیا جاتا ہے۔ سید سلیمان ندوی کے بعد بالترتیب شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی ناظمِ دارالمصنفین اور مدیرِ 'معارف' رہے۔ سید نجیب اشرف ندوی بھی ایک عرصے تک اس ادارے سے وابستہ رہے ہیں۔ دارالمصنفین کے مقاصد حسب ذیل تھے :

- ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہلِ قلم کی جماعت پیدا کرنا۔
- بلند پایہ کتابوں کا ترجمہ۔
- تصنیف شدہ کتابوں اور دیگر علمی وادبی کتابوں کی طبع واشاعت۔

یہ ادارہ اگرچہ دینی علوم اور تاریخ کے تعلق سے جدید تحقیق وتصنیف کو فروغ دینے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا لیکن یہاں اردو زبان وادب سے متعلق کتابوں کی تصنیف اور تحقیق وتدوین کی جانب بھی توجہ دی گئی۔

2019-20

© NCERT not to be republished

دارالمصنفین نے اب تک دوسو سے زیادہ علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ان میں سات جلدوں پر مشتمل 'سیرت النبیؐ'، 'سیر الصحابہؓ' اور 'تاریخِ اسلام' کو بہت مقبولیت ملی۔'الفاروق'، 'شعر العجم'، 'خطباتِ مدراس'، 'سیرتِ عائشہؓ'، 'خیّام'، 'عرب و ہند کے تعلقات'، 'اُسوۂ صحابہؓ'، 'موازنۂ انیس و دبیر' اور 'اقبالِ کامل' جیسی کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ دارالمصنفین سے وابستہ اہلِ قلم میں سب سے نمایاں شخصیت مولانا سید سلیمان ندوی کی ہے۔

ادبِ لطیف :

سرسیّد اور حالؔی کی اصلاحی تحریک کے بعد اردو ادب میں ایک نئے رجحان کو مقبولیت حاصل ہوئی۔نثر میں ایک نئے اسلوب کی بنیاد پڑی جسے 'ادبِ لطیف' کہا جاتا ہے۔ادبِ لطیف کے نمائندوں نے ایک ایسے اسلوبِ نثر کو رواج دینے کی کوشش کی جس کی پہچان شعریت اور جذباتیت سے وابستہ تھی۔یہ کوشش کسی منظّم تحریک کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس نے مختلف ادیبوں کے نثری اسلوب میں ایک حاوی رجحان کی صورت اختیار کرلی تھی اس لیے اس اسلوب کو کبھی رومانی اسلوب کا نام دیا گیا، کبھی ادبِ لطیف کے نام سے یاد کیا گیا۔اب اسے ادبِ لطیف ہی کی ذیل میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ان ادیبوں پر محمد حسین آزاد کی شگفتہ نثر کا گہرا اثر تھا۔آزاد کی نثر کو بھی رومانی نثر کہا جاتا ہے۔یہ ادیب جمالیاتی قدروں کے پاسدار اور حسن کے پرستار تھے۔ادبِ لطیف کے لکھنے والوں نے عام طور پر حسنِ فطرت اور حسن و عشق کے معاملات کو اپنا موضوع بنایا۔یہ ادیب رابندر ناتھ ٹیگور کی نثر سے بھی متاثر ہوئے۔عبدالحلیم شرؔر، میر ناصر دہلوی، خلیق دہلوی، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوشؔ، ل احمد وغیرہ کی نثر کو ادبِ لطیف کی نمائندہ نثر سے منسوب کیا جاتا ہے۔

دارالترجمہ عثمانیہ، حیدرآباد (1917) : دارالترجمہ عثمانیہ، حیدرآباد کا شمار بیسویں صدی کے اہم تصنیفی اداروں میں ہوتا ہے۔اس کے قیام کا بنیادی مقصد سائنس اور دوسرے علوم وفنون کی نصابی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔

نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں کی تخت نشینی کے بعد 'حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس' کی بنیاد رکھی گئی۔سر اکبر حیدری کو اس کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔اس کانفرنس کی علمی و ادبی کوششوں سے ایک نیا شعور پیدا ہوا۔نظام نے علم و ادب کی ترقی میں خاص دل چسپی لی۔اس وقت حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو تھی اس لیے ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کی

© NCERT not to be republished

ضرورت محسوس کی گئی جہاں اردو میں اعلیٰ تعلیم دی جا سکے۔ سب سے بڑا مسئلہ اردو میں نصابی کتابوں کی دستیابی کا تھا۔ اسی مقصد کے تحت عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے پہلے 1917 میں تالیف و ترجمہ کا شعبہ قائم کیا گیا جسے 'دارالترجمہ' کہتے ہیں۔ دارالترجمہ میں اصطلاحات اور ترجمے کے کام کو بخوبی انجام دینے اور نصابی کتب کی تیاری کے لیے کئی کمیٹیاں بنائی گئیں جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے :

- **مجلسِ وضعِ اصطلاحات:**
  اس کمیٹی کا کام انگریزی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کرنا اور اردو میں نئی اصطلاحات وضع کرنا تھا۔
- **مجلسِ اہلِ علم وفن:**
  یہ مجلس مختلف علوم کے ماہرین پر مشتمل تھی جن سے وضع اصطلاحات کے سلسلے میں مشورہ لیا جاتا تھا۔
- **مجلسِ انتخابِ نصابات:**
  یہ مجلس درس و تدریس کے لیے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا انتخاب کرتی تھی۔
- **مجلسِ نظرِ ثانی:**
  ترجمہ شدہ کتابوں اور وضع کردہ اصطلاحات پر یہ کمیٹی نظرِ ثانی کرتی تھی۔
- مذہبی نقطۂ نظر سے ترجموں پر غور کرنے والی کمیٹی
- ادبی نقطہ نظر سے ترجموں کو دیکھنے والی کمیٹی۔

دارالترجمہ سے علی حیدر نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، مولوی وحیدالدین سلیم، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی اور جوش ملیح آبادی جیسی شخصیتیں وابستہ تھیں۔ ان میں وحیدالدین سلیم کا نام سب سے نمایاں ہے۔

دارالترجمہ میں پہلے ابتدائی سے ثانوی جماعتوں تک کی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ 1919 میں جب عثمانیہ یونیورسٹی وجود میں آئی تو اعلیٰ درجات کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے اور اصطلاحات وضع کی گئیں۔ ان میں آرٹس، سائنس، کامرس کے علاوہ قانون، میڈیکل اور انجینئرنگ کی کتابیں بھی اردو میں تیار کی گئیں۔ دارالترجمہ میں مختلف علوم وفنون کی 465 کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ اس ادارے نے 1917 سے 1948 تک اپنی عظیم الشان روایات کو برقرار رکھا۔ 1950 میں عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دے دیا گیا۔

ترقی پسند تحریک (1936) :

بیسویں صدی کا ہندوستان سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے کئی طرح کے مسائل سے دو چار تھا۔ ملک میں ان کے حل کے لیے طرح طرح کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ ادیبوں نے بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصّہ لیا۔ اس طرح کی کوششوں میں ترقی پسند تحریک کا نام سرفہرست ہے۔ اردو ادب میں سرسید تحریک کے بعد یہ سب سے بڑی ادبی تحریک تھی جس کا مقصد ادب کو سماج سے جوڑنا تھا۔ لندن میں مقیم چند نوجوان ہندوستانی طلبا نے 1935 میں 'ترقی پسند مصنفین کی انجمن' قائم کی۔ ملک راج آنند کو اس انجمن کا صدر مقرر کیا۔ تحریک کا ایک منشور تھا جس پر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے۔ ایس بھٹ، ڈاکٹر ایس سنہا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے دستخط کیے تھے۔ اس منشور میں یہ کہا گیا تھا کہ ''ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہورہی ہیں، پُرانے خیالات اور معتقدات کی جڑیں ہلتی جارہی ہیں اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہیئت کا لباس دیں اور ملک کو ترقی کے راستے پر لگانے میں ممّد ومعاون ہوں۔''

ان نوجوانوں میں بدلتے ہوئے دور کا احساس پہلے ہی سے موجود تھا۔ 1932 میں 'انگارے' نام کی کتاب شائع ہوئی جس کے افسانوں میں توہم پرستی، بداعتقادی، اندھی تقلید اور جعت پسندی کے خلاف احتجاج تھا۔ یکم اپریل 1936 کو لکھنؤ میں ترقی پسند ادبی تحریک کی پہلی کانفرنس ہوئی جس کی صدارت پریم چند نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے جو خطبہ دیا، وہ بہت مشہور ہوا۔ اس موقعے پر اپنے خطبے میں انھوں نے ترقی پسندی کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا :

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حُسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سُلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''

اس تحریک نے جہاں ادب کے معیار کو بدلا اور بلند کیا، وہیں اس نے سماج سے گہرے رشتے بھی استوار کیے۔ غریبوں، مظلوموں، سماج کے دبے کچلے لوگوں کے استحصال اور ان کی حق تلفی کے خلاف آواز بلند کی۔ ملک کی آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اردو نظم کو نئی منزلوں اور بلندیوں تک پہنچایا۔ ناول، افسانہ اور ڈراما جیسی اصناف میں کئی نئے انقلابی مسائل اور موضوعات کو جگہ دی۔ اس طرح ہمارے ادب کے سرمایے میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

© NCERT not to be republished

ترقی پسند شعرا میں فیض احمد فیضؔ، مخدومؔ محی الدین، سردارؔ جعفری، کیفیؔ اعظمی، مجروحؔ سلطانپوری، جاں نثار اخترؔ اور احمد ندیم قاسمی کے نام اہم ہیں۔ فکشن نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس کی خاص اہمیت ہے۔ سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد اور انتظار حسین کے افسانوی فن کی شناخت اسی دور میں قائم ہوئی لیکن اپنے رویوں میں یہ ترقی پسند نہیں تھے۔

حلقۂ اربابِ ذوق (1939):

حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام 16/ اکتوبر 1939 کو لاہور میں عمل میں آیا۔ پہلے اس کا نام 'بزمِ داستان گویاں' تھا۔ اس کے تحت ادبی نشستیں منعقد ہوتی تھیں جن میں شعری اور افسانوی ادب پر جدید مغربی تنقیدی تصورات کے تحت بحث کی جاتی تھی۔ اس بزم کے ادبی گروہ میں دن بہ دن اضافہ ہوتا رہا اور بعد میں اس بزم کا نام 'حلقۂ اربابِ ذوق' ہو گیا۔ 'ترقی پسند تحریک' اور 'حلقۂ اربابِ ذوق' دونوں تنظیمیں ایک ہی دور میں ادبی منظر نامے پر ظاہر ہوئیں۔ اپنے ادبی نظریات کے اعتبار سے یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ترقی پسند تحریک 'ادب برائے زندگی' پر زور دیتی ہے جب کہ 'حلقۂ اربابِ ذوق'، 'ادب برائے ادب' پر اصرار کرتا ہے۔

حلقے کی بنیاد ڈالنے والوں میں حفیظ ہوشیار پوری، شیر محمد اخترؔ، تابشؔ صدیقی، محمد افضل اور سید نصیر احمد شاہ کے نام اہم ہیں۔ بعد میں میرا جی اور ن.م. راشد حلقے میں شامل ہوئے۔ ان دونوں نے مل کر 'حلقۂ اربابِ ذوق' کے اغراض و مقاصد طے کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ یہ حضرات مغربی ادیبوں کے علاوہ فرائڈ اور یونگ کے نظریات سے متاثر تھے۔ میرا جی نے علامتی زبان پر زور دیا۔ موضوع کے برخلاف ہیئت کے تجربے کو اہمیت دی۔ اسی دور میں آزاد نظم کی بنیادیں مستحکم ہوئیں اور غیر رسمی زبان کو فروغ ملا۔ میرا جی اور ن.م. راشد کے علاوہ جن لوگوں نے 'حلقۂ اربابِ ذوق' کے مقاصد عام کرنے میں اہم رول ادا کیا ان میں قیوم نظر، مختارؔ صدیقی، یوسف ظفر اور ضیاؔ جالندھری وغیرہ کی خاص اہمیت ہے۔ لاہور کے بعد 'حلقۂ اربابِ ذوق' کی دوسری شاخ 1941 میں ضیا جالندھری کے ایما پر دہلی میں قائم ہوئی جس کی نشست ہر ہفتے اینگلو عربک کالج میں ہوا کرتی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد ملک و بیرون ملک کے کئی شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں اور اس کی تشہیر کے لیے رسالے بھی نکالے گئے۔ حلقے نے شعر و ادب کے جن نئے تصورات کی بنیاد رکھی تھی، ان میں سے بعض تصورات کو نمائندہ ادیبوں نے بھی برقرار رکھا۔ موجودہ ادوار میں بھی کسی حد تک ان کی معنویت قائم ہے۔

جدیدیت :

جدیدیت ایک رجحان ہے۔ بعض نقادوں نے اسے تحریک بھی کہا ہے۔ جدیدیت کو ایک مسلسل میلان کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ہر دور میں اس کی پہچان کے عناصر مختلف ہوتے ہیں۔ جدیدیت کے اوّلین سرے علامت نگاری کے اس رجحان سے ملتے ہیں جس کے آغاز وارتقا کا تعلق مغرب میں انیسویں صدی کے نصفِ آخر سے ہے۔ علامتی رجحان نے تخلیقی زبان کا ایک نیا تصور دیا تھا۔ روایت شکنی بھی کی گئی اور روایت کو نئے معنی بھی دیے گئے۔ اسلوب و ہیئت کی نئی صورتیں وضع ہوئیں جو انفرادی تجربے کی مظہر تھیں۔ یہ سلسلہ بیسویں صدی کے نصفِ اوّل تک بڑے زور وشور کے ساتھ جاری رہا۔ جب کہ ہمارے یہاں اس کے آثار 1955 کے بعد سے ملتے ہیں۔ جدیدیت نے صرف شاعری، افسانوی ادب اور ڈراما وغیرہ ہی پر گہرے اثرات قائم نہیں کیے بلکہ مصوّری، موسیقی اور عمارت سازی جیسے فنون پر بھی اُس نئے تخلیقی ذہن کی کارکردگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے جسے جدید کہا جاتا ہے اور جس کی حسیت بھی جدید کہلاتی ہے۔

جدیدیت نے ہیئت و موضوع کی وحدت پر زور دیا اور اس امر پر بھی اصرار کیا کہ تخلیقی زبان کثرتِ معنی کی حامل ہوتی ہے۔ اور کثرتِ معنی سے ابہام پیدا ہوتا ہے۔ ابہام، حیرت ہی کا موجب نہیں ہوتا، مزید جاننے کے لیے ہماری جستجو کو سرگرم بھی رکھتا ہے۔ جدیدیت کے فکری سلسلے وجودیت سے ملتے ہیں۔ جدیدیت نے ذات کے تجربے، فرد کی اہمیت اور انفرادی آزادی جیسے تصورات وجودیت ہی سے اخذ کیے ہیں۔ اجنبیت، بے گانگی اور تنہائی کے احساس نے ذات کے اسی تجربے سے نمو پائی ہے۔ اکثر ادیبوں نے قدروں کے بحران کو بھی خاص عنوان دیا ہے۔

جدید ادب میں یہ موضوعات حاوی رجحان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، عمیقؔ حنفی، شفیق فاطمہ شعریٰؔ، قاضی سلیم، محمد علویؔ، بلراج کومؔل، شہریاؔر، عادل منصوریؔ، زبیر رضویؔ، ندؔا فاضلی، باقرؔ مہدی اور وحیدؔ اختر کی شاعری نئے انسان کے باطنی اضطراب کی مظہر ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جو جدیدیت کی نمائندہ کہلاتے ہیں۔

پاکستان میں وزیر آغا، جیلانی کامران، محمد سلیم الرّحمٰن، محمد صفدر، ساقیؔ فاروقی، شکیب جلالی، شہزؔاد احمد، ظفرؔ اقبال، احمد مشتاق اور افتخار جالبؔ نے شاعری میں جدیدیت کے رجحان کو فروغ دیا اور ایک نئی تخلیقی زبان پر ترجیح رکھی۔ خواتین میں کوثر ناہید، فہمیدہ ریاض، عذرا عباس، نسرین انجم بھٹی، شائستہ حبیبؔ، پروین شاکرؔ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

اردو افسانوی ادب میں سریندر پرکاش، غیاث احمد گدّی، جوگندر پال، اقبال مجید، اقبال متین، بلراج مین را کا فن نئے طرز احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان فن کاروں نے اُن محسوسات کو بھی زبان دینے کی کوشش کی ہے

جنھیں مبہم کہا جاتا ہے۔ اکثر کرداروں کو نام دینے کے بجائے اسمائے ضمیر سے کام لیا گیا یا 'میں' کو ترجیح دی گئی۔ واقعے سے گریز برتا گیا۔ پلاٹ کی رسمی تنظیم سے بھی انحراف کی کوشش کی گئی۔ اس قسم کے بعض تجربے اہم بھی ہیں۔ انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کا دور بھی جدیدیت کے عہدِ عروج سے تعلق رکھتا ہے لیکن انھیں جدیدیت کا نمائندہ نہیں کہا جاتا کیوں کہ 1960 سے قبل ہی ان کی انفرادیت قائم ہو چکی تھی۔

مابعدِ جدیدیت :

ادبی رجحانات کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ادب کا شعبہ ہمیشہ نت نئی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ تبدیلی زندگی ہی نہیں، ادب کا بھی تقاضا ہے۔ ادب میں جب کوئی چھوٹی یا بڑی تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی محض یک طرفہ یا ادب ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ علم اور زندگی کے دوسرے بہت سے شعبوں میں بھی اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جدیدیت بھی ایک ثقافتی صورتِ حال تھی جس نے لفظ و معنی اور ان کے باہمی رشتے پر نئے سرے سے غور کرنے پر اُکسایا تھا۔ اردو میں 60-1955 سے تقریباً 85-1980 تک جدیدیت ایک حاوی رجحان کی حیثیت سے تخلیقی فن کاروں کی دل چسپی کا خاص موضوع تھا۔ دراصل مابعدِ جدیدیت بھی ایک نئی ثقافتی صورتِ حال کی مظہر ہے۔ مثلاً

- الیکٹرونک میڈیا (برقیاتی ذرائع) اور انفرمیشن ٹکنولوجی (اطّلاعاتی تکنیک) میں غیر معمولی ترقی۔
- ایک نئی صارفی تہذیب کے تحت بازار کا ایک بڑی قوت کے طور پر نمودار ہونا۔
- بازار محض چیزوں کی خرید و فروخت تک محدود نہیں ہے بلکہ علم، لفظ، معنی اور دماغ نے بھی خرید و فروخت کی اشیا کی صورت اختیار کر لی۔
- سرمایہ داری کا غیر معمولی طور پر فروغ جس نے زر پرستی کو ہوا دی۔ معاشی مقصد نے تمام دوسرے مقاصد پر سبقت حاصل کر لی۔
- عالمی سطح پر مذہبی و تہذیبی سخت گیری، نسل پرستی، فرقہ واریت اور آپسی منافرت کے جذبوں نے ان اعلیٰ انسانی قدروں کو پیچھے دھکیل دیا جو عمومی فلاح و خیر خواہی کی مظہر تھیں۔

درج بالا صورتِ حال کے پہلو بہ پہلو جس ادبی تھیوری کو مابعد جدید کہا جاتا ہے اور اس کا اصرار جن امور پر ہے، انھیں اس صورت میں ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

- لفظ کسی منطقی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ وہ من مانے ہوتے ہیں۔ یعنی لفظ کا اس کے معنی سے کوئی منطقی رشتہ نہیں ہوتا۔

© NCERT not to be republished

- لفظ کے معنی بھی مستقل نہیں ہوتے۔ ان کا کوئی مرکز نہیں ہوتا۔ یعنی لفظ کے معنی گھڑی کے پنڈولم کی طرح ڈولتے رہتے ہیں اسی لیے ادب کی تفہیم ہمیشہ جاری رہنے والا عمل ہے۔
- معنی بھی بڑھتے اور پھیلتے ہیں، یعنی معنی کی افزائش کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔
- معنی قائم کرنے والا مصنف نہیں، قاری ہوتا ہے۔
- معنی ہی نہیں ہر شئے، ہر نظریہ، ہر حقیقت مرکز گریز ہے۔ انتشار اور بکھراؤ ہی مابعدِ جدیدیت کی پہچان ہے۔
- جدیدیت کی طرح مابعدِ جدیدیت بھی 'کیا' کے بجائے 'کیسے' کو خاص اہمیت دیتی ہے اسی لیے کسی بھی فن پارے کے پیچھے کارفرما اُن قاعدوں کی جستجو کرنا چاہیے جن سے اس نے تشکیل پائی ہے۔
- مابعد جدیدیت استناد (authority) اور روایتی قوانین و معیار (Canons) کو حتمی قرار نہیں دیتی۔ وہ ہر اس قدر، صداقت، اصول، قانون اور روایت کو سوال زد کرتی ہے جسے عمومی کسوٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
- کوئی تخلیق یا کوئی بھی متن معصوم اور بے میل نہیں ہوتا۔ دوسرے، بہت سے متون کا وہ زائدہ ہوتا ہے۔ مابعد جدید تھیوری اسی کو بین المتونیت سے تعبیر کرتی ہے۔
- زبان شفّاف میڈیم نہیں ہے اسی لیے ادبی تفہیمات و تعبیرات میں اختلاف کی گنجائش قایم رہتی ہے۔ یہ اختلاف ہی اس بات کا مظہر ہے کہ معنی واحد ہے نہ خود مکتفی۔
- پس ساختیات (ردِ تشکیل)، ساختیاتی تحلیلِ نفسی، نَو مارکسیت، نَو تاریخیت، ثقافتی مطالعات، تانیثیت، پس نَو آبادیات جیسے تصورات کا بھی مابعدِ جدید تھیوری میں خاص درجہ ہے۔

اردو میں جن نقادوں نے خاص اہمیت کے ساتھ اس تھیوری کو اپنی تنقید کا سرگرم موضوع بنایا ان میں گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، فہیم اعظمی، قمر جمیل، ضمیر علی بدایونی، وہاب اشرفی اور قاضی افضال حسین کی تحریریں خاص وقعت رکھتی ہیں۔

غالب اکیڈمی (دہلی) (1969) :

اردو کے ممتاز شاعر مرزا غالب کی یاد میں غالب اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ اس اکیڈمی کے بانی معروف طبیب حکیم عبدالحمید تھے۔ علم و ادب سے دلی شغف اور غالب سے تعلقِ خاص نے انھیں غالب صدی کے موقع پر اس ادارے کے قیام پر آمادہ کیا۔ 'غالب اکیڈمی' غالب سوسائٹی کے زیرِ اہتمام کام کرتی ہے۔ جس کی عمارت اور دفتر بستی حضرت نظام الدین (ویسٹ) نئی دہلی میں واقع ہے۔ غالب اکیڈمی کی عمارت غالب کے مزار کے قریب ہے۔ اس

© NCERT not to be republished

اکیڈمی کے زیرِ اہتمام غالب میوزیم، لائبریری اور آرٹ گیلری، تحقیقی گوشہ، اشاعتی شعبہ، بک سنٹر اور سیل کاونٹر کے علاوہ ایک آڈیٹوریم بھی ہے۔

اس ادارے کے زیرِ اہتمام غالب اور ان کے عہد و معاصرین پر بے شمار کتابوں کے علاوہ بڑی تعداد میں اردو زبان و ادب سے متعلق کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ایک رسالہ 'غالب' بھی اس ادارے کی جانب سے شائع کیا جاتا ہے۔ غالب اکیڈمی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کے ایک اہم مرکز کے طور پر قومی سطح پر اپنی اہمیت رکھتی ہے۔

غالبؔ انسٹی ٹیوٹ (1971) :

1969 میں غالبؔ صدی تقریبات کے موقع پر سابق وزیرِ اعظم اندرا گاندھی اور فخر الدین علی احمد کی سربراہی میں غالبؔ میموریل کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس کی کوششوں سے 1971 میں غالبؔ کی یاد میں ایک اہم ادارہ 'غالب انسٹی ٹیوٹ' کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کی عمارت اور دفتر ماتا سندری لین، نئی دہلی میں واقع ہے۔ 'غالب انسٹی ٹیوٹ' غالبؔ اور معاصرینِ غالب کے علاوہ اردو کی ممتاز شخصیتوں اور دیگر موضوعات پر کتابیں شائع کرتا ہے۔

اس ادارے کے ذریعے اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف موضوعات و مسائل پر سیمیناروں اور مذاکروں کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ ان میں غالب پر منعقد کیا جانے والا سالانہ بین الاقوامی سیمینار خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس سیمینار میں ملک اور بیرونِ ملک کے کئی بلند پایہ نقاد اور اسکالرس شرکت کرتے ہیں۔ اس ادارے کے زیرِ اہتمام ایک ششماہی رسالہ 'غالب نامہ' بھی شائع کیا جاتا ہے۔ ادارے کی عمارت میں سیمینار ہال، لائبریری اور غالب میوزیم کے علاوہ 'ایوانِ غالب' کے نام سے ایک بڑا آڈیٹوریم بھی ہے جس میں مختلف مواقع پر ادبی و ثقافتی پروگراموں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ 'غالب انسٹی ٹیوٹ' کا شمار ملک کے اہم اردو اداروں میں ہوتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (نئی دہلی) (1996) :

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا قیام 1996 میں عمل میں آیا۔ اس ادارے کی حیثیت اردو زبان کے فروغ کے لیے قومی نوڈل ایجنسی کی ہے۔ اس سے قبل اس کا نام 'ترقی اردو بیورو' تھا جسے اردو زبان کے فروغ کے لیے مرکزی وزارت تعلیم و ثقافت نے قائم کیا تھا۔ 'قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان' ایک خود مختار ادارہ ہے لیکن اس کا انتظام و انصرام مرکزی حکومت کی 'وزارت فروغِ انسانی وسائل' کے ذمّے ہے۔

'قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان' کا موجودہ دفتر فروغ اردو بھون، جسولا وہار، نئی دہلی میں واقع ہے۔ اس ادارے کے تحت اردو زبان وادب کے فروغ سے متعلق مختلف سطحوں پر اقدامات کیے جاتے رہے ہیں۔ مختلف اسکیموں کے تحت بڑی تعداد میں ادبی، لسانی، تاریخی، تکنیکی اور دیگر موضوعات پر کتابیں شائع کرنے کے علاوہ مصنفین کی جانب سے کتابوں کی اشاعت، مالی تعاون، کتابوں کی خریداری، یونیورسٹیوں اور کالجوں و دیگر اداروں کو سمیناروں اور مذاکروں کے انعقاد کے لیے مالی امداد دینے جیسے اقدامات اس ادارے کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔ کونسل کے ذریعے ملک کے مختلف حصوں میں غیر سرکاری تنظیموں کے اشتراک سے کمپیوٹر سینٹرس بھی چلائے جاتے ہیں۔ ادارے کے زیرِ اہتمام 'فکر و تحقیق' اور 'اردو دنیا' کے نام سے دو رسالے بھی شائع ہوتے ہیں۔ کونسل بچوں کے ادب میں ترقی کے لیے ایک رسالہ 'بچوں کی دنیا' کے نام سے شائع کرتی ہے۔ اس طرح ایک قومی ادارے کی حیثیت سے کونسل اردو زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

مندرجہ بالا اداروں کے علاوہ ملک میں بہت سے ایسے سرکاری وغیر سرکاری ادارے قائم ہیں جو اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے کوشاں ہیں۔ ایسے اداروں میں این سی ای آر ٹی دہلی، ساہتیہ اکادمی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ دہلی، اردو اکادمی دہلی، فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ کے علاوہ مختلف ریاستی سرکاروں کے ذریعے قائم کردہ اردو اکادمیاں ہیں جو اردو کے فروغ سے متعلق مختلف قسم کے اقدامات کر رہی ہیں۔ ان اکادمیوں میں خاص طور سے اتر پردیش اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، ہریانہ اردو اکادمی، آندھرا پردیش اردو اکادمی، کرناٹک اردو اکادمی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، مہاراشٹر اردو اکادمی، گجرات اردو اکادمی قابلِ ذکر ہیں۔

© NCERT not to be republished